کتاب نما

اقبال، ایک مسلم سیاسی مفکر، ڈاکٹر مشیر الحق۔ مرتبہ: ماہ طلعت علوی۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ صفحات: ۸۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم برسوں تک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں علوم اسلامیہ کے استاد رہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عابد حسین کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔ چنانچہ اس مجموعے کے دیباچہ نگار پروفیسر آل احمد سرور کا یہ کہنا بے جا نہیں کہ مشیر الحق، جامعہ سکول کی دانش ورانہ روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزید برآں ان کی "اعلیٰ تعلیم مانٹریال میں پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ کے سائے میں ہوئی"--- اس روایت، تعلق اور سائے کے اثرات، زیر نظر مجموعہ مضامین میں صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں--- مشیر الحق، عمر کے آخری حصے میں کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کے وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ اپریل ۱۹۹۰ میں نامعلوم افراد نے انھیں اغوا کر لیا اور چند روز بعد گولی مار کر شہید کر دیا۔

اقبال کے انگریزی خطبات (Reconstruction) پر توجہ و اعتنا کا رجحان حالیہ برسوں میں نمایاں ہوا ہے۔ پروفیسر مشیر الحق، مطالعہ خطبات اقبال کے اس مکتب فکر کے پرجوش علم بردار نظر آتے ہیں جو خطبات کو، اقبال کی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ان کے خیال میں اقبال کے "مذہبی خیالات" سے آگاہی بھی خطبات ہی کے ذریعے ہوتی ہے اور اصل اقبال وہ ہے جس کی فکر و دانش خطبات (نہ کہ شاعری) میں مضمر ہے۔ افسوس ہے کہ بہ حال اسے دریافت نہیں کیا گیا۔ وہ اقبال کی شاعری پر خط تنسیخ کھینچ کر یا اسے پس پشت ڈال کر، فکر اقبال کی تعبیر، محض خطبات کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اقبال کے فلسفے کو "ان کے اشعار کی بھول بھلیوں سے باہر نکل کر ان کے خطبات میں دیکھنا چاہیے، جسے ایک طرح سے ان کے مذہبی خیالات کا متن کہا جا سکتا ہے"۔ (ص ۴۲)

خیال رہے کہ ۱۹۸۷، ۱۹۸۸ کے زمانے میں اقبال، اجتہاد اور پارلیمنٹ کی تکون پر پاکستانی اخبارات میں جو دلچسپ بحث چلی، اس میں ایک بزرگ (ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، وفات: ۴ر اپریل ۱۹۹۵) نے خطبات کو فکر اقبال کا بنیادی ماخذ اور اسے اقبال کی جملہ تصانیف میں ان کی نمایندہ کتاب اور ان کی اردو فارسی شاعری کو

ثانوی نوعیت کی چیز قرار دیا تھا۔

بلاشبہ فکر اقبال کی تفہیم میں خطبات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے مگر اس کوشش میں، اقبال کے باقی شعری و نثری متن کو نظرانداز کرنا پرلے درجے کی بے انصافی ہوگی۔ یہ اصرار قطعی بے جواز ہے کہ اقبال کو اول و آخر، خطبات کے ذریعے سمجھا جائے اور یہ کہنا تو سراسر زیادتی یا نادانی ہے کہ "اقبال، ان خطبات کو حاصل زندگی سمجھتے تھے" (ص ۴۴)۔ اقبال نے تو "جاوید نامہ" کو اپنا Life Work بتایا تھا (مکتوب بنام محمد جمیل، Letters of Iqbal، مرتبہ: بشیر احمد ڈار، ص ۱۱۹)۔

جناب مشیر الحق کو شکوہ ہے کہ ہمارے علما نے خطبات اقبال پر توجہ نہیں دی، اگرچہ مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ان پر ایک کتاب لکھی، مگر علی میاں، سید سلیمان ندوی جملہ علماے کرام--- اور اقبال کے درمیان، خطبات کے حوالے سے ایک مغائرت موجود تھی--- ہمارے خیال میں علامہ اقبال اور علماے کرام دونوں، اسلام کے بارے میں ایک دوسرے کے اخلاص کے قائل تھے۔ علامہ اقبال، اسلام کی نشوونما کے لیے اجتہاد کو ضرورت سمجھتے تھے اور علما نے بھی اجتہاد کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اقبال نے خطبات میں اپنی بعض آرا غور و فکر کے لیے پیش کی ہیں مگر ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ اب اگر علما، خطبات کے بارے میں کچھ تحفظات رکھتے ہیں اور انھیں اقبال کا "حاصل زندگی" نہیں سمجھتے تو اسے فروعی اختلاف سمجھنا چاہیے، نہ کہ بنیادی مغائرت۔

پروفیسر مشیر الحق کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اقبال کے نزدیک اجتہاد، حقیقتاً اسلام کی حرکی روح کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، خود اپنی جگہ مقصد نہیں ہے--- لیکن اقبال کا منشا، انھیں جن پاکستانی علما اور دانش وروں کے اجتہادی رویوں میں نظر آیا (یا مشیر الحق صاحب نے اجتہادی رویّوں کے انطباق کے لیے جنھیں چنا) وہ ہیں: مولانا جعفر شاہ پھلواروی، عمر احمد تھانوی اور عباد اللہ اختر--- کیا دیانت داری سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تین اصحاب پاکستانی مذہبی فکر کے نمایندے ہیں؟ (۳۱ علما، کسی شمار و قطار میں نہیں آتے)۔

پروفیسر مشیر الحق نے ایک جگہ ادارہ دارالاسلام جمال پور، نزد پٹھان کوٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "اقبال کا دارالاسلام، مولانا مودودی کے دارالاسلام سے بہت مختلف تھا۔ اقبال فرد کی تربیت کرنا چاہتے تھے۔ دونوں کا ذہن مختلف تھا، مطمح نظر الگ تھا اس لیے یقینی ہے کہ اگر اقبال زندہ رہے ہوتے تو دونوں کے اختلافات کھل کر سامنے آ جاتے--- اور جسے دنیا دیکھتی، اس پر پردہ ہی پڑا رہ گیا" (ص ۴۶)۔ قطع نظر اقبال و مودودی کے اختلافات کو دیکھنے کی اس شدید حسرت کے، جو مشیر الحق مرحوم کے آخری دو تین جملوں میں چھپی ہوئی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر ذہن اور مطمح نظر کا ایسا ہی شدید اختلاف تھا تو اقبال نے، مولانا کو بلایا ہی کیوں؟ (وہ خود معترف ہیں: "انھوں نے حیدر آباد سے مدیر ترجمان القرآن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کو بلا کر اس

ادارے کی باگ سپرد کر دی"۔)

پروفیسر مشیر الحق نے اقبال کو ایک سیاسی مدبّر یا ایک ماڈرن مسلم مفکر کے طور پر بھی ناکام قرار دیا ہے۔ اول تو وہ یہ تسلیم کرنے میں متامّل ہیں کہ اقبال کے ہاں قیام پاکستان کا کوئی تصور ملتا ہے۔ چوں کہ خطبہ الٰہ آباد اور خاص طور پر قائداعظم کے نام خطوط کی، بجز اس کے، کوئی اور توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ اقبال ہندی مسلمانوں کے تہذیبی اور اسلامی تشخص کی بقا کے لیے شمال مغربی ہندستان میں، مسلم مرکزیت کے قائل تھے، اس لیے مشیر الحق، اسے اقبال کی "بدنصیبی" قرار دیتے ہیں کہ وہ ایک "بڑے اور وسیع علاقے میں اسلام کو نافذ کرنے کی فکر" سے دست بردار ہو کر "ایک مختصر سے علاقے میں بند ہو کر" رہ گئے (ص ۱۴)۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اقبال: "عالمی سطح کی بات تو چھوڑیے، کل ہند سطح پر بھی مسلم معاملات کا کوئی جامع تشفی بخش حل" پیش نہیں کر سکے۔

مختلف مسائل کے بارے میں مشیر الحق کے ذہن اور ان کی پسند و ناپسند کا اندازہ، ان کے انداز و اسلوب، خصوصاً کہیں کہیں ان کے طنزیہ لہجے سے بھی ہوتا ہے، مثلاً: پاکستان کے بارے میں: "اقبال کی آخری عمر کا یہ خواب ان کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد پورا ہوا اور دنیا کے نقشے میں ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا، "عالم اسلام" کا تھوڑا سا رقبہ اور بڑھا" (ص ۷۳)۔ عالم اسلام اور مسلمانوں کے مسائل و معاملات کے تذکرے میں ان کا (رویہ ہمدردانہ کم ہے اور) طنزیہ لہجہ کھٹکتا ہے، خصوصاً: "اقبال، اپنی شکست کی آواز" میں۔ اس مضمون کا عنوان مرزا غالب کے مصرعے کے حوالے سے، اقبال کی "ناکامی" پر ایک گہرے طنز یا چوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تصحیح طلب: مولانا مدنی اور اقبال کے درمیان قومیت کے مسئلے پر تحریری مباحثہ انتقال سے "چند برس پہلے" (ص ۷۳) نہیں، چند ہفتے پہلے ہوا تھا۔ اسی طرح افغانستان ہجرت کرنے والے ظفر حسن ایبک تھے، نہ کہ "ظفر بیگ" (ص ۶۵)۔ بہتر ہے کہ "صلعم" (ص ۳) کو "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا جائے یا صرف ؐ۔

مصنف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اقبال نے فرد کو اپنا اصل مخاطب بنا کر، فرد کی کردار سازی کو بنیادی اہمیت دی ہے اور انھوں نے انسان کے اندرون کو بدلنے کا جو پیغام دیا تھا، وہ آج بھی ہر ایک کے لیے معنویت رکھتا ہے۔ اس کتاب سے علامہ اقبال اور پاکستان کی بارے میں معاصر بھارتی مسلم دانش وروں کا ذہن سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

(۱) The Quranic Treasures

(۲) Gifts from Muhammad مرتبہ: خرم مراد، ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر۔ صفحات:

۶۰، ۶۴۔ قیمت: درج نہیں۔

حیات انسانی قطعی عارضی و فانی ہے، مگر اس کا ایک ایک لمحہ کائنات کی سب سے قیمتی متاع کی حیثیت رکھتا ہے۔ خرم مراد مرحوم، بساط بھر، زندگی اور وقت کے "بہترین استعمال" (the best use of) کے لیے کوشاں رہے۔ عمر کے آخری برس، وہ قلب کے معالجے کے لیے برطانیہ میں مقیم تھے، ان کا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوا۔ مرحوم کی تصنیفی و تالیفی کاوشوں کا کچھ حصہ سامنے آ چکا ہے، مگر متعدد تحریریں ہنوز تشنہ طباعت ہیں۔ ان کی وفات: (۱۹ دسمبر ۱۹۹۶) کے بعد منصۂ شہود پر آنے والے جیبی تقطیع کے دو کتابچے اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔

پہلا کتابچہ قرآن حکیم کی منتخب آیات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ دو صفحاتی دیباچے میں دل نشین پیرائے میں خیال انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن کیا کہتا ہے؟--- یہ جاننا اس لیے اہم اور ضروری ہے کہ اس نے انسانی تہذیب و تاریخ پر نہایت گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس نے بے شمار انسانوں کی فکر و سوچ کو تبدیل کیا اور ان کی زندگیوں کو تاثر و تحرک عطا کیا اور انھیں ایک خاص راستے پر گامزن کیا۔ یہ عمل چودہ سو سال سے جاری ہے۔ پھر یہ کہ جملہ الہامی کتابوں میں، قرآن ہی واحد کتاب ہے جس کے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے کلام الٰہی کو پیغمبر کی زبان سے سنا، ان کی زندگیاں حیرت انگیز طور پر منقلب ہوئیں۔ یہ ایسا کلام ہے جس نے ایک نئے انسان اور ایک نئے معاشرے کو جنم دیا۔ قرآن کے پیروکار، دنیا کی امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ کیوں کہ قرآن علم و دانش کا مرقع اور روشنی کا منبع ہے--- اور اس طرح کے مدلل نکات، جو قاری کے دل و دماغ کو اپیل کرتے ہیں۔

دوسرے کتابچے میں، منتخب احادیث نبویؐ کے تراجم کو چالیس عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ مرحوم نے یہ انتخاب اس دعا کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ دنیا مقصدیت، سمت سفر، انصاف اور عفو و درگزر سے عاری ہو کر نفرت، بے انصافی اور تشدد کا شکار بن چکی ہے--- خدا کرے نبی کریمؐ کے یہ منتخب اقوال و فرامین اس دنیا کے لیے حرارت و روشنی اور مسرت و امن کا باعث ثابت ہوں۔

دونوں کتابچے، اعلیٰ معیار پر طبع و شائع کیے گئے ہیں۔ (کاش اردو کتابوں کو بھی یہ معیار نصیب ہوتا۔) اور یہ خوب صورت تبلیغی تحفے، انگریزی خواں، خصوصاً غیر مسلم طبقے تک قرآن و حدیث کی تعلیمات پہنچانے کا موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ (ر-ہ)

مسئلہ کشمیر کے امکانی حل، مرتبہ: ارشاد محمود، ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۴۰۔ قیمت: ۷۰ روپے۔

مقبوضہ کشمیر کے جنت کدے کو خون رنگ کرنے والے بنیا سامراج نے وحشت و درندگی کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔ ظلمت کی خون آشام رات بظاہر کٹتی دکھائی نہیں دیتی، تاہم انسانی تاریخ کا یہ فیصلہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جہد و جہاد کے قافلے کو آگ اور آہن بھی نہیں روک سکتے۔ آج اہل کشمیر کی بے چارگی کی ذمہ داری مسلم ممالک کے منصب اقتدار پر قابض ان حکمرانوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو عالمی سامراج کے اشاروں پر امت مسلمہ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ حکمران زبانی جمع و خرچ کے بجائے بھارت کا معاشی اور سماجی مقاطعہ کرتے، تو مقبوضہ کشمیر میں عصمت و عفت اور جان و مال کی پامالی کا گھناؤنا کھیل کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔

زیر نظر کتاب میں امت مسلمہ کے اسی، سلگتے ہوئے، مسئلے کے ایسے مختلف حل زیر بحث لائے گئے ہیں، جو استصواب رائے کے علاوہ، تجویز کیے جاتے ہیں۔ ان میں خود مختار کشمیر، ٹرسٹی شپ (دس سالہ تولیت)، لسانی بنیادوں پر تقسیم، جنگ بندی لائن بطور مستقل سرحد اور جموں لداخ وادی اور شمالی علاقہ جات سمیت آزاد کشمیر کی تین منطقوں میں تقسیم وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح کیمپ ڈیوڈ اور اوسلو قسم کے معاہدوں کے امکانات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

یہ کتاب چھ مقالات پر مشتمل ہے: مسئلہ کشمیر، منظر و پس منظر از ارشاد محمود۔ تقسیم کشمیر ایک جائزہ از پروفیسر نذیر احمد شال۔ مسئلہ کشمیر اور ٹرسٹی شپ از ڈاکٹر ایس ایم قریشی۔ خود مختار کشمیر کا مقدمہ از امان اللہ خان۔ خود مختار کشمیر کیوں نہیں؟ از شیخ تجمل الاسلام اور تھرڈ آپشن علاقائی اور جغرافیائی تناظر میں از ارشاد محمود۔ مرتب نے اپنے دونوں مقالات میں تحقیقی اور تجزیاتی انداز سے پاکستان سے کشمیر کے الحاق کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر شال نے اپنے فاضلانہ مقالے میں غیر جذباتی استدلال کی بنیاد پر ان تمام تجاویز کو مسترد کیا ہے جو تقسیم کشمیر سے منسوب ہیں۔ پاکستان کے سابق سفیر ڈاکٹر ایس ایم قریشی نے تاریخ عالم اور اقوام متحدہ کی آئینی دستاویزات کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ کشمیر کو کسی بھی حوالے سے ٹرسٹی شپ کے جال میں نہیں پھنسایا جا سکتا۔ انھوں نے قانون بین الاقوام کی روشنی میں مسئلے کی نزاکت اور حقیقت کو مہارت سے واضح کیا ہے۔ امان اللہ خان نے خود مختار کشمیر کا مقدمہ بظاہر معروضی حقائق کے حوالے سے پیش کیا ہے، اور پہلی نظر میں قاری اس سے متاثر بھی ہوتا ہے، تاہم اگلے مقالات میں تصویر کا دوسرا رخ سامنے آتے ہی اس پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شیخ تجمل الاسلام نے خود مختار کشمیر کے تصور کی بھرپور اور مدلل تردید اور الحاق پاکستان کے نظریے کی تائید کی ہے۔ تاہم شیخ صاحب اپنے استدلال کو جذباتی رنگ اور تکرار مضمون سے پاک رکھتے تو بہتر ہوتا۔ کتاب کے دیباچہ نگار ڈاکٹر طاہر امین کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ "پاکستان کے پالیسی ساز افراد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو مسئلہ کشمیر دوبارہ لمبے عرصے

کے لیے سرد خانے میں چلا جائے گا..... پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کا عدم توازن ہی دراصل اس مسئلے کے حل ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے" (ص ۶)۔

کتاب کے آخر میں شامل ضمیمہ جات میں، مسئلے سے متعلق وثائق کو ترتیب زمانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلو اور اس کے بارے میں مختلف موقف جاننے کے لیے یہ مختصر کتاب مفید و مددگار ہے اور اپنے موضوع پر ایک جامع دستاویز قرار دی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے کشمیریات میں یہ ایک عمدہ اور بامعنی اضافہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)

تالیف، ڈاکٹر خورشید رضوی۔ ناشر: شہ تاج مطبوعات لاہور۔ صفحات: ۲۶۴۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

زیر نظر کتاب کے زیادہ تر مضامین چند علمی و ادبی شخصیات کے بارے میں ہیں جن میں سے بعض کے ساتھ مصنف کو براہ راست ملاقات اور صحبت و گفتگو کا موقع حاصل ہوا اور بعض کے ساتھ ان کے برسوں پر پھیلے ہوئے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم رہے۔ ان میں انور مسعود، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور علامہ عبدالعزیز میمن کے اسماے گرامی نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں رضوی صاحب نے ان علمی و ادبی اکابر کے بارے میں بھی قلم اٹھایا ہے جو نہ صرف اپنے زمانے میں آسمان علم و ادب کے درخشاں آفتاب تھے بلکہ وہ ابھی تک شعر و ادب اور علم و آگہی کی دنیا میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔ شخصیات کے علاوہ بعض علمی و ادبی موضوعات پر کچھ مضامین اور تراجم کتاب کے آخری حصے میں شامل ہیں جس سے کتاب متنوع اور افادیت کے اعتبار سے دوچند ہو گئی ہے۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ علمی ثقاہت کے بوجھ تلے شاعری اور تحریر کی شگفتگی دم توڑ جاتی ہے مگر خورشید رضوی کی نثر کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ خالص علمی موضوع کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے بھی ان کی تحریر کی سلاست، روانی اور شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ ہم عصر شخصیات کے بارے میں لکھنا پل صراط پر گامزن ہونے کے مترادف ہے۔ تعریف ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو بے اعتدالی--- اور نشتر تنقید کے استعمال میں اگر ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو جائے تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ خورشید صاحب اس نازک کام سے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوئے ہیں۔

خورشید صاحب کو اللہ نے قوی حافظے کی عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ جو شے ایک مرتبہ ان کی نظر سے گزر گئی، اسے ان کے ذہنی کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیا۔ اسی بنا پر وہ برسوں پہلے کسی دوست سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر آئے ہیں اور آتے ہی انھوں نے قارئین کو وہ باتیں سنانا شروع کر دی ہیں۔ شخصیت نگار کا حافظہ اتنا قابل اعتماد ہو تو اس کی بیان کردہ باتیں

بھی اتنی ہی قابل اعتبار ہو جاتی ہیں۔

علامہ عبدالعزیز میمن اور پیر محمد حسن نہایت وقیع علمی شخصیات ہیں۔ ان پر مضامین سے قاری کو ان کے بلند پایہ علمی مقام و مرتبے کے بارے میں آگہی ہوتی ہے۔ علمی مباحث کا ذکر ایسے خوش گوار پیرائے میں کیا گیا ہے کہ قاری نہ صرف اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ علمی مباحث سے نہایت دلچسپی کے ساتھ استفادہ کرتا ہے۔ ناصر کاظمی، مجید امجد اور ضمیر جعفری ایسی ادبی شخصیات کا تذکرہ قدرے مختلف رنگ میں ہوا ہے۔ وہ انھیں کوئی مافوق الفطرت مقام نہیں دیتے بلکہ ان کی بشری کمزوریوں کا لطیف پیرائے میں ذکر کرتے ہیں مگر اس سے ان کی مجموعی عظمت کا تاثر زیادہ واضح انداز میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور انور مسعود کو خورشید رضوی نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے ساتھ ان کے برسوں پر پھیلے ہوئے بے تکلفانہ تعلقات قائم ہیں۔ اس لیے یہاں مشاہداتی رنگ اور بھی گہرا ہے۔ وہ ان شخصیات کے طبائع کے مختلف رنگوں کو پوری چابک دستی کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

دو مضامین نادیدہ شخصیات کے بارے میں ہیں۔ ایک طٰہٰ حسین کے بارے میں اور دوسرا نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ اور ان کے ادبی کام اور مقام کے بارے میں۔ دونوں مضامین نہایت وقیع ہیں۔ پاکستان کے ادبی و علمی حلقوں میں نجیب محفوظ اور ان کے ادبی مقام و مرتبے کو جاننے کی زبردست خواہش موجود تھی۔ اس مضمون سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ عربی ادب ہی کے سلسلے میں دو اہم مضمون "عربی شاعری اندلس میں" اور "اقبال، عربی اور دنیاے عرب" پوری علمی جستجو اور تحقیقی لگن کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ایک اور مضمون کے ذریعے ہندی ادب کے ایک کلاسیکل شاہکار "پنچ تنتر" کو نہایت عمدہ انداز میں اردو ادب کے قارئین سے متعارف کرایا گیا ہے۔

متفرق نویسی پر مشتمل یہ کتاب خورشید رضوی کے وسعت مطالعہ، ذہنی کشادگی اور عمدہ ادبی ذوق کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ اس کتاب کی پذیرائی کے بعد خورشید رضوی اپنے علمی و تحقیقی مشاغل کے ساتھ ساتھ اس متفرق نویسی پر بھی توجہ دیں گے اور اپنے شگفتہ و موثر طرز تحریر سے اردو کے سرمایہ ادبی کو مالا مال کرتے رہیں گے۔ (ڈاکٹر حسین احمد پراچا)

تذکرۃ القرّاء، محمد الیاس الاعظمی۔ ناشر: دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ضلع فیض آباد، یوپی۔ صفحات: ۲۱۷۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

قرآن کریم سات متداول قراءتوں میں تلاوت کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد فن قراءت کے سات امام ہیں۔ پھر ان میں سے ہر امام فن کے دو دو شاگرد ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے امام کے اسلوب اور لہجے کو

آگے منتقل کیا ہے۔ یوں قراءَت کے چودہ لہجے اور اختلاف ہیں۔ اسلوب اور لہجے سے آگے بڑھ کر الفاظ اور تلفظ کے اختلافات بھی ہیں جو سب معروف اور جائز ہیں۔ بعض تفاسیر قرآن میں ان اختلافات کی نشان دہی کر دی گئی ہے، جیسے علامہ ابن جوزی کی "زاد المسیر" میں۔

زیر نظر کتاب میں بیس قاری حضرات (امام نافع، امام ابن کثیر، امام حفص، امام عاصم، امام عبداللہ ابن عامر شامی وغیرہ) کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو اس فن کے اساتذہ ہیں۔ ان میں سب سے پہلے امام نافع مدنی کا نام آتا ہے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ مدینۃ النبیؐ کے رہنے والے تھے۔ وہ کثیر الشیوخ تھے، یعنی جن اساتذہ سے انھوں نے قرآن کریم سبقاً سبقاً پڑھا، ان کی تعداد کثیر ہے، مثلاً: حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت ابو ہریرہؓ ان کے اساتذہ تھے اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم پڑھا اور سیکھا تھا۔ امام نافع مدنی کے ایک شاگرد کے بارے میں صرف ایک بات ملاحظہ کیجیے۔ وہ متواتر پچاس سال (تیس سال تعلیم کے دوران میں اور بیس سال حصول تعلیم کے بعد) اپنے استاد امام نافع کو قرآن پاک سناتے رہے اور فن قراءَت کے رموز و نکات ان سے سمجھتے رہے۔ فن قراءَت میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ، یہ قاری حضرات، علم حدیث اور علم شریعت میں بھی اپنے دور کے ممتاز علما کرام میں شمار ہوتے تھے۔

یہ کتاب قاری حضرات کے علاوہ مدارس کے طلبہ کے لیے بھی معلومات افزا ہے۔ (عاصم نعمانی)

IQBAL : from Finite to Infinite، معین الدین عقیل۔ ناشر: ابو الکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۱/۱ علی گڑھ کالونی، کراچی۔ صفحات: ۵۹۔ قیمت: درج نہیں۔

جامعہ کراچی میں شعبہ اردو کے استاد، ڈاکٹر معین الدین عقیل (حال استاد اردو، ٹوکیو یونی ورسٹی) نے زیر نظر کتاب میں متحدہ ہندستان میں نظریہ اسلامی قومیت کے فروغ پر علمی انداز میں جان دار بحث کی ہے۔ بیسویں صدی کا سیاسی مدّوجزر اور فکر اقبال کے پس منظر میں آزادی کی تحریک کا ارتقا بھی دکھایا گیا ہے۔ عموماً اقبال کو سمجھنے کے لیے اردو کلام کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے، مذکورہ تحقیق میں اقبال کے فارسی کلام اور نثری تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر انگریزی زبان میں یہ ایک جامع اور مربوط تحریر ہے۔ تاریخ، سیاسیات اور اقبالیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایک مفید اور عمدہ تحفہ ہے۔ (محمد ایوب منیر)